محمد حسین عرشی

اقبالؒ کے کرم فرما*

دیکھا تو نہیں ، سنا ہے کہ ایک شاعر نے شیخ سعدی کے "پند نامہ کریما" کو مسدس کی صورت میں تضمین کیا اور اس کے تمام اشعار کو امام حسین رضی اللہ عنہ کا مرثیہ بنا دیا ۔

ایک اور ایسی ہی بات سننے میں آئی ہے کہ ایک فاضل نے نحو کی مشہور کتاب "کافیہ" کی ایسی شرح لکھی کہ اُسے تصوّف کی کتاب ثابت کر دیا ۔

اس سے ان لوگوں کا مقصد کسی کو دھوکا دینا نہیں تھا ، بلکہ اپنی ذہانت کے غیر معمولی ہونے کا ثبوت مہیا کرنا تھا کہ ہم چاہیں تو کسی مصنف کو اس کے اصلی اور واضح مقصد و موضوع کے خلاف بھی استعمال کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں ۔

یہ تو خیر انسانوں کی آپس میں تفریحات تھیں ۔ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ بعض ضرورت سے زیادہ بے باک لوگوں نے خدائے جبار و قہار کے ساتھ بھی ایسی جسارت کرنے سے پرہیز نہیں کیا ۔

تحریر و تصنیف کی پوری دنیا میں جو ہزارہا سال کو محیط ہے ایک اور صرف ایک کتاب ہے اللہ کی کتاب جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے ۔ اس کے نزول کو چودہ صدیاں گزر گئیں ۔ اس کے کسی لفظ ، حرف ، زیر ، زبر ، پیش ، جزم یا تشدید میں آج تک کوئی تبدیلی یا کمی بیشی نہیں ہو سکی ۔ حالانکہ قبل و بعد کے بے شمار مصنفوں کی کتابوں کے مختلف نسخوں میں الفاظ و عبارات کے کثیر اختلافات پائے جاتے ہیں ، مثلاً "مثنوی معنوی" کا جو نسخہ پروفیسر نکلسن نے مرتب کیا ہے انھوں نے قدیم و جدید قلمی و مطبوعہ نسخے مہیا کر کے ان میں سینکڑوں اشعار الحاقی ثابت کیے اور سینکڑوں ایسے جو قدیم ترین نسخوں میں ملتے ہیں لیکن عام مطبوعہ نسخوں میں موجود

*اقبال اکاد می میں ایک خصوصی نشست مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۷۵ میں پڑھا گیا ۔

نہیں ۔ پنجاب کے مشہور شاعر وارث شاہ کو کوئی بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا ۔ اس کا کوئی نسخہ اس وقت موجود نہیں ہے جس کو وثوق سے تمام و کمال اس کی تصنیف کہا جا سکے ۔ میاں ہدایت اللہ ، پیراں دتا ، اور استاد سوختہ امرتسری کے اضافہ شدہ نسخے بازار میں عام ملتے ہیں ۔

بائبل ، جسے کتابِ مقدس کہا جاتا ہے ، کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے تو اس میں بھی ایسی ہی دھاندلی مچی ہوئی ہے ۔ کئی اناجیل جن کے صرف نام رہ گئے ہیں غائب کر دی گئیں ۔ عبارات میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے ۔ آج تک یہ بھی تحقیق نہیں ہو سکا کہ بائبل کے مختلف صحیفے کس کس زبان میں نازل ہوئے تھے ، ان کا ربانی متن کہیں موجود بھی ہے یا نہیں ؟

ہمارے ہاں بھی کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو خدا کے حفاظتی بند کو توڑ کر قرآن حکیم کے اندر تو نہ گھس سکے ، لیکن انھوں نے باہر سے ممکن حد تک گولہ باری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ کئی آیتیں بلکہ سورتیں تک تصنیف کر ڈالیں اور مشہور کر دیا کہ یہ قرآن ہی کا حصہ تھیں لیکن (نعوذ باللہ) قرآن سے نکال دی گئی ہیں ۔ ایسی ایک سورت عہدِ عالم گیری کی تصنیف "دبستان المذاہب" میں موجود ہے جس کا نام "سورۂ نورین" لکھا ہے ۔ اس میں قرآنی آیات کی نقالی کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ بھی آپ نے سنا ہوگا کہ بعض لوگوں کے نزدیک اصل قرآن میں بہت سے پارے تھے ، بعد میں تیس رہ گئے ، اور بعض کے نزدیک متعدد سورتیں موجودہ قرآن میں نہیں ہیں ۔ سنا ہے کہ وہ مزید پاروں والا قرآن کسی کتب خانہ میں موجود ہے اور دیکھا جا سکتا ہے ۔ اس ستم گری کی تفصیل دیکھنی ہو تو "اہلِ سنت پاکٹ بک" ص ۲۲ سے ص ۵۹ تک مطالعہ فرمائیے (تصنیف علامہ دوست محمد قریشی) ۔

اس کے علاوہ ایک دوسری طرح کا حملہ قرآن کریم پر یہ کیا گیا کہ اس کے معانی و مطالب ایسے بیان کیے گئے جن کا عربی لغت و محاورہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو محمد حسین الذہبی کی کتاب "التفسیر و المفسرون" مطبوعہ قاہرہ میں دیکھیے جو تین مجلدات پر مشتمل ہے ۔ اس میں اقسامِ تفسیر پر مورخانہ بحث کی گئی ہے ۔ اس وقت اس کی تیسری جلد پیشِ نظر ہے جو ۱۹۶۲ میں شائع ہوئی ۔ تفسیر کی مشہور قسموں میں سے بعض کے نام سنیے : تفاسیر امامیہ اثنا عشریہ ، اسماعیلیہ باطنیہ ، زیدیہ ، خوارج ، صوفیہ ، اشاریہ ، فلاسفہ ، فقہا ، وغیرہ وغیرہ ۔

اشاری قسم کی تفاسیر میں سے ایک تفسیر "التاویلات النجمیہ" بہت اہم سمجھی جاتی ہے ۔ یہ سات مجلدات پر مشتمل ہے ۔ اس کے دو مصنف ہیں : شیخ نجم الدین (متوفی ۶۵۴ھ) اور علاء الدولہ (مولود ۶۵۹ھ) ۔ ان کے علم و فضل اور زہد و ورع کی بہت تعریف کی گئی ہے ۔ مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں : ہر آیت کے سات بطن ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں ، بطن قالبیہ ، نفسیہ ، سرّیہ روحیہ ، خفیہ اور حقیہ ۔ لہٰذا ہر آیت کی سات تفسیریں ہوئیں جو ایک دوسری کے خلاف ہیں ۔ مفسر کے اپنے الفاظ یہ ہیں : علی ھذہ بطونِ اسبعتہ سبع تفسیراتٍ ، کل یخالف الاخر (ص ۶۱) ، حالانکہ قرآن حکیم اپنے بے اختلاف ہونے کو وحی الٰہی ہونے کی دلیل میں پیش کرتا ہے — لو کان من عند غیراللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا (نساء ، ۸۲) ۔

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں : ''ہر آیت کے ستر بطن ہوتے ہیں ، بلکہ سات سو تک" ۔ ذرا سا نمونہ بھی چکھ لیجیے ۔ سورۂ یوسف کی آیت قال نسوۃ فی المدینہ ۔ ۔ ۔ میں ذکر زنانِ مصر کا ہے جو عزیزِ مصر کی بیوی پر طعن کرتی تھیں کہ وہ اپنے غلام سے شغف رکھتی ہے ۔ صاحب تفسیر فرماتے ہیں کہ یہاں عورتوں سے مرد انسانی جسم کے اندر نفسانی ، بہیمی ، درندہ اور شیطانی صفات ہیں اور عزیز کی بیوی سے مراد دنیا ہے اور اپنے جس غلام کو وہ اپنے دام میں لانا چاہتی تھی وہ قلب ہے'' وغیرہ ذالک ۔

ایک اور مسفر القاشانی ہے جس کو بعض لوگ صوفی اور بعض باطنی کہتے ہیں ۔ اس کا نام عبدالرزاق (متوفی ۷۳۰ھ) ہے ۔ اس کی تفسیر الشیخ الاکبر محی‌الدین ابن عربی کی طرف منسوب کی جاتی ہے ۔ سورۂ بقرہ کی آیت و اذ قال ابراہیم رب اجعل ھذا بلداً آمنا و ارزق اہلہ من الثمرات کی تفسیر میں فرماتے ہیں : ''بلد یعنی شہر سے مراد سینہ ہے جو قلب کا حرم ہے اور ثمرات یعنی پھلوں سے مراد روح کے معارف ، حکمتیں اور انوار ہیں'' ۔

لکھنو کے نوابی دور کے متعلق ایک کتاب ''بادشاہ بیگم" کے نام سے تھوڑا ہی عرصہ ہوا شائع ہوئی ہے ۔ اس میں مشہور آیت ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم یعنی تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے ، کے معنی یہ لکھے گئے ہیں کہ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ تقیہ کرنے والا ہے ۔

ان نمونوں سے اندازہ کیجیے کہ پورے کلام مجید کو کس طرح لغت و محاورۂ عرب ، تفسیرِ نبوی ، صحابہ ، تابعین اور جمہور مفسرین سے بے نیاز ہو کر

کہاں سے کہاں لے گئے ۔ بقول علامہ اقبال

ہوئے اس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں ۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کوئی صدیوں پرانے فلسفی ، شاعر یا مصنف نہیں ہیں ۔ ان کے دیکھنے ، جاننے اور ملنے والے کئی کہن سال اشخاص ابھی تک زندہ اور اس بلس میں بھی موجود ہیں جن میں سے ایک یہ فقیر بھی ہے جو اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہے ۔ آخر یہ موجود اشخاص بھی ، جن کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے ، اپنی آخری منزل سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں ۔ ان لوگوں نے علامہ کو قریب سے دیکھا ہے ۔ ان کی آنکھوں سے اُن کے اعمال وعقائد پنہاں نہیں رہ سکتے تھے اور علامہ کے بعد خود ان کی لازوال تصانیف ان کے دین و مذہب اور افکار و خیالات کی سچی ترجمانی کرتی رہیں گی ۔

لیکن فارسی کی مشہور کہاوت "دروغ گویم بر روئے تو" ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو علامہ کی تصانیف سے ایسے مطالب نکالتے ہیں جو ان کی اپنے فکر و عقیدہ کا ترجمہ تو ہو سکتے ہیں ، لیکن علامہ کی طرف ان کی نسبت بہتانِ صریح کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی ۔

ہر انسان کی زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں ۔ وہ ماں کے پیٹ سے بالغ اور پختہ کار ہو کر پیدا نہیں ہوتا ۔ اس کی جسمانی ساخت اور وضع قطع کی طرح اس کے فکر و خیال میں بھی ارتقائی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ۔ ایک مغربی فلسفی نے کہا ہے کہ جو شخص اپنے خیالات نہیں بدلتا وہ دماغ نہیں رکھتا ۔ انسان گائے بھینس نہیں ہے جو اپنے روزِ اول سے آج تک وہی ہے جو ہزارہا صدیاں پہلے تھی اور ایسی ہی ہمیشہ رہے گی ۔

ایک صحبت میں علامہ نے کہا تھا : "ذہنی لحاظ سے ایک شخص پر اس وقت موت طاری ہوتی ہے جب نئے افکار قبول کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں رہتی" ۔[1]

اگر ایک نابغۂ روزگار شخص کبھی پہلی جماعت میں تھا اور عام بچوں کی طرح ننگ دھڑنگ پھرتا تھا تو اس کی اس حالت کو اس کی پوری زندگی پر تو منطبق نہیں کیا جا سکتا ۔

علامہ اپنے بچپن ، جوانی ، طالب علمی اور پھر پختگی اور بڑھاپے تک پہنچتے ہوئے مختلف ادوار سے گزرے اور وسعتِ مطالعہ و تجربہ کے ساتھ اپنے خیالات میں

۱۔ خلیفہ عبدالحکیم ، "فکر اقبال" ، ص ۲۲۳ ۔

ارتقائی تبدیلیاں بھی کرتے رہے ۔ چنانچہ ''باقیات اقبال'' کے نام سے ان کا جو مجموعۂ کلام ان کی رحلت کے بعد شائع ہوا ہے انھوں نے اس کی تمام منظومات کو اپنے کلام میں شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا جیسے غالب نے اپنے ''نسخۂ حمیدیہ'' کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا تھا ۔

اس کا مطلب صاف ہے کہ علامہ ان خیالات سے دست کش ہو چکے تھے جن کی اشاعت ان کو پسند نہ تھی ۔ پھر ان کی جو نظمیں اور کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں بھی وہ بڑی احتیاط سے مقدم و موخر کے فرق کو واضح کرنے کے لیے سنینِ تصنیف درج کرتے رہے ہیں تاکہ قاری کو ان کے ارتقائی مدراج کا علم ہوتا رہے ۔ اس قسم کے قبل و بعد کے تضاد و تخالف کو انھوں نے خود بھی محسوس کیا ہے :

عجب نہیں جو پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشان نہیں تو کچھ بھی نہیں

یعنی انسانی خیالات میں اس قسم کا تفاوت فطری ہے ۔

خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں :

''آج کل اکثر تحریروں اور تقریروں میں اقبال کے کلام کے حوالے نظر آتے ہیں لیکن کہنے والا اپنی حمایت میں کچھ اشعار چن لیتا ہے اور اقبال کو اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے :

متفق گردید رائے بو علی با رائے من

''اقبال میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے وہ یا ارتقائے فکر کا نتیجہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف عبور کر گیا، جس طرح انسان طفولیت سے شباب اور شباب سے شیب کی جانب بڑھتا ہے ۔ علامہ خود فرماتے ہیں کہ : 'میں تشکیک اور تفلسف کی ظلمات میں سے ہوتا ہوا ایمان و یقین کے آب حیات تک پہنچا ہوں'' ۔ اسے تضاد نہیں کہہ سکتے ۔ یہ ارتقا کوش زندگی ہے ۔''[۲]

اب اگر کوئی منکرِ خدا مادہ پرست علامہ کے دورِ تشکیک و تفلسف کے کسی شعر یا فقرہ کو پیش کر کے ان کو اپنا ہم خیال دہریہ یا متشکک ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو نہ صرف ان کے ساتھ بلکہ اپنے ضمیر کے ساتھ بھی خیانت کا مرتکب ہوتا ہے ۔

اسی طرح ان پر ایک ایسا دور بھی آیا جب وہ وجودی صوفیہ کے خیالات

۲۔ ایضاً ، ص ۲۴۷ ۔

سے متاثر ہوئے ، اگرچہ بعد میں اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو الحاد و زندقہ تک کہ دیا ۔[۳] لیکن فلسفہ وحدۃ الوجود کے بعض سطحی قائل ان کی پوری شاعری اور پوری زندگی پر اس عقیدے کی مہر لگا دیتے ہیں ۔ انھوں نے اپنے کلام میں سرمایہ داری کی مخالفت کی اور قرآنی تعلیمات کی بنا پر کی ، جیسے کہ ہمارے قدیم بزرگ بھی حرصِ مال کی مذمت کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ لیکن بے خدا سوشلزم کے لفظی حامی جن کے عملاً اس سے بھی کوئی سروکار نہیں ، علامہ کو سوشلسٹ بنانے پر تلے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح مسلمانوں کے مختلف فرقے جو آپس میں سخت بیر رکھتے اور ایک دوسرے کو ضالی ، ملحد ، کافر اور واجب القتل تک کہنے سے دریغ نہیں کرتے سب اپنی اپنی تقریر و تحریر میں اپنے مطلب کے مطابق علامہ کا کوئی نثری فقرہ یا شعر ڈھونڈ نکالتے ہیں اور علامہ کی عام تعلیم اور زندگی کے سیاق و سباق سے الگ کر کے علامہ کے عقیدت مندوں اور عوام کو دھوکا دینے کی جسارت کرتے ہیں ۔ حالانکہ علامہ نہ کسی سیاسی ازم کے معتقد تھے اور نہ کسی مخصوص اسلامی فرقے میں محدود تھے ۔ وہ قرآنِ پاک کی اس نصِ صریح سے واقف تھے کہ فرقہ پرستی شرک کے مترادف بلکہ بعض صورتوں میں اس سے بھی بدتر ہے ۔ ۱۹۳۰ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد کے خطبۂ صدارت کی تمہید ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عام مسلمانوں سے الگ اپنا کوئی ٹولہ بنانا پسند نہیں کرتے تھے اور کسی مخصوص مکتبِ فکر و خیال کے پیرو بھی نہیں تھے ۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں : ''میں کسی جماعت کا رہنما نہیں ، نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں ۔''[۴] ایسے پر معنی لفظ کسی معمولی دماغ میں پیدا ہی نہیں ہو سکتے ۔ وہ صرف اسلام کے پیرو تھے ۔ اسلام اُن کا دین تھا ، اسلام ان کی سیاست تھی ، اسلام ان کی زندگی ، اسلام اور صرف اسلام ہی کی طرف انھوں نے پوری دنیا اور خصوصاً مسلمانوں کو دعوت دی ۔ ان کے کان میں یہ لازوال آواز آ رہی تھی : ''ان الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً لست منھم فی شی'' (انعام ، ۱۵۹) یعنی جن لوگوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور بہت سے فرقے بن گئے (اے رسول !) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہ رہا ، یعنی امت اپنے پیغمبر سے کٹ گئی ، اس کے روحانی و اخلاقی فیضان سے محروم ہو گئی ، جیسے ندی اپنے منبع سے محروم

۳۔ شیخ عطاءاللہ ، مرتب ، ''اقبال نامہ'' ، حصۂ اول ، ص ۴۴ : سراج الدین پال کے نام تیسرا مکتوب ۱۹ جولائی ۱۹۱۴ ۔

۴۔ ''مضامینِ اقبال'' ص ۷ ۔

ہو جائے تو خشک ہوتی ہے ۔ کیا اقبال اپنے آپ پر اور اپنی قوم پر یہ عذاب گوارا کر سکتے تھے ؟

اور سنیے : لا تکونوا من المشرکین : مسلمانو ! تم مشرکین میں سے نہ ہو جانا ۔ اب یہاں کوئی بھی اپنے آپ کو مشرک ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا ، لیکن قرآنِ پاک نے اس لفظ کو شرح کیے بغیر نہیں چھوڑا ۔ وہ اس کے بالکل متصل واضح کر دیتا ہے کہ مشرک کی پہچان کیا ہے ۔ من المشرکین من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعاً کل حزب بمالدیھم فرحون (روم : ۳۱ - ۳۲) ، مشرکین وہ ہیں جنھوں نے پھوٹ ڈالی اپنے دین میں ، اور ہوگئے بہت فرقے ۔ ہر فرقہ اپنے اپنے فرقہ وارانہ خیالات پر فریفتہ ہے ، یعنی ایک ہی دین والوں کا بہت سے فرقے بن کر اپنے اپنے خیالات کو صحیح اور دوسروں کو غلط ثابت کرتے رہنا بھی من جملۂ صفاتِ شرک ہے ۔

کیا ایسے مصنوعی اور انسانوں کے ساختہ پرداختہ اسلام کی طرف اقبال ایسا وسیع العلم شخص ساری دنیا کو دعوت دے سکتا تھا ؟ اور خود مسلمانوں کے جنگ آزما فرقوں کو انہی میں سے کسی ایک پر جمع کرنے کا غیرممکن خیال بھی کر سکتا تھا !

ہمارا یہ پارہ پارہ ہونا دیکھ کر ان کے منہ سے اس قسم کی فریادیں نکلتی رہتی تھیں :

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت کعبہ را کردند آخر خشت خشت

کیا وہ کسی ایک خشت کو ہاتھ میں لے کر کہہ سکتے تھے کہ یہی کعبۂ مکرمہ ہے — اس کی طرف رخ کر کے سجدہ کرو ۔ اور سنیے ! قرآن اس سے آگے بڑھتا ہے ۔ وہ جو تاریخی واقعات بیان کرتا ہے اس کا مقصد محض تاریخ یا اس کے سنین و شہور بتانا نہیں ہوتا ۔ ان میں ہمارے لیے ہدایت ، موعظت اور حکمت کے جواہرات ہوتے ہیں ۔

موسیٰ علیہ السلام اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام پر خفا ہو رہے ہیں کہ انھوں نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا کرتے دیکھا اور منع کیوں نہ کیا ۔ یہ ایک شرکِ جلی تھا اور ہارون پیغمبر کے سامنے ہو رہا تھا ۔ وہ خاموش کیوں رہے ؟ اس حکیمانہ سکوت کی وجہ خود انہی کی زبان سے سنیے : انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی ('طٰہٰ : ۹۴) ، (اے موسیٰ !) میں ڈرا کہ تو کہے گا کہ (اے ہارون !) تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال

دی اور میری بات یاد نہ رکھی ۔۵ ظاہر ہے کہ اگر اس موقع پر ہارون علیہ السلام اس مشرکانہ حرکت کے خلاف تقریر کرتے تو کچھ لوگ ان کے ساتھ ہو جاتے اور کچھ دوسرے اپنی ضد پر اڑے رہتے ۔ اس طرح قوم میں پھوٹ پڑ جاتی ۔ انھوں نے وقتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک شرک کے خلاف اقدام نہیں کیا ، لیکن پھوٹ کر گوارا نہیں گیا ، یعنی پھوٹ کو اس سے بھی بدتر سمجھا ۔ خدائے زمین و آسمان ہم مسلمانوں کو صدیوں پہلے گزرا ہوا واقعہ کیوں سنا رہا ہے ؟ اس میں کیا مصلحت اور سبق ہے ؟ کاش مسلمان سمجھیں !

مولانا عبدالسلام ندوی اپنی مستند کتاب "اقبالِ کامل" میں علامہ کے ذاتی حالات میں ایک ذیلی عنوان "مذہب" قائم کرتے ہیں ۔ اس میں لکھتے ہیں :

"وہ مذہب کے پرجوش مبلغ ہو گئے اور یورپ سے پلٹنے کے بعد وہ برابر مذہب کی تبلیغ کرتے رہے لیکن یورپ سے پلٹنے کے بعد انھوں نے جس مذہب کی تبلیغ کی وہ فرقہ آرائی سے بلند تھا ۔ وہ اس اسلام کے داعی تھے جس کی دعوت خود قرآن مجید نے دی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے اشارات بلکہ تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق ان کا عروۃ الوثقیٰ صرف قرآن تھا ۔ مثنوی رموز بے خودی میں فرماتے ہیں :

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

"ہمارے صوفیہ کے ہاں قوالی میں علامہ کا کلام تصوف کی تائید میں وجد و حال کا مورد ٹھہرایا جاتا ہے ، لیکن خود علامہ کا تبصرہ اس پر کیا ہے ؟ غور سے سنیے ؟

صوفی پشمینہ پوشِ حال مست از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش در نمی سازد بقرآن محفلش

"یعنی علامہ شعر بازی کی بجائے قرآن حکیم کو زیب مجالس بنانا چاہتے ہیں ۔ اسی طرح ہمارے واعظ برسر منبر اپنی پسندیدہ روایات کے ساتھ علامہ کے اشعار کو اپنے فرقے کی تائید میں پیش کرتے ہیں اور علامہ انھیں بھی قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں :

واعظ دستان زنِ رخسانہ بند معنی او پست و حرف او بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او باضعیف و شاذ و مرسل کار او

۵۔ شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں کہ موسیٰ جاتے وقت کہ گئے تھے کہ قوم کو متفق رکھیو ۔

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب

صد جہاں باقی ست قرآں ہنوز اندکے خود را در آیاتش بسوز

"یعنی ہر دینی ، اخلاق ، علمی اور سیاسی مقصد کے لیے اس کو رہنما بناؤ ، اس کی حدود میں رہ کر عقلی ، فکری اور شورائی ترقیاں کرو۔"[٦]

علامہ چشمِ پُر آب اور قلبِ پُرگداز کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے ۔ وہ قرآن پاک کو ایک عالم گیر اور غیر زمانی دعوت کا داعیٔ عظیم سمجھتے تھے ۔ قرآن نے خود کم از کم بائیس مرتبہ "یا ایہا الناس" کہہ کر پورے عالم انسانیت کو پکارا ہے ، چھ بار "امتِ واحدہ" کا مطالبہ دھرایا ہے ۔ ہر دور اور ہر ملک و ملت کے انسانوں کو "نفسِ واحدہ" سے ان کی تخلیق تین بار یاد دلائی ہے ۔ سات مرتبہ بنی آدم اور یا بنی آدم کہہ کر تمام نوعِ انسانی کے ایک کنبہ ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت فرمائی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین ، پیغمبرِ قرآن کا وصف رحمۃ اللعالمین اور خود قرآن کی شان ذکرٌ للعالمین وارد ہوئی ہے ۔ غور فرمائیے! جس عالی دماغ نابغۂ روزگار کی رگ رگ میں ایسی وسیع النظرف اور محیط الکل کتاب کی آیات رچ چکی ہوں کیا وہ اپنے آپ کو کسی مخصوص و محدود ٹولی یا انسانوں کے بنائے ہوئے کسی ازم میں محصور و مقید کر سکتا ہے؟ — وہ ازم جو کل بنے اور تجربے کی کسوٹی پر آ کر آج فیل ہو رہے ہیں ۔ کارل مارکس کی اشتراکیت کا جو تصور اس کے ذہن میں تھا آج اس کے نام نہاد پیرو ملکوں کے کسی گوشے میں رائج نہیں ۔ جتنے ممالک اشتراکیت کا دعویٰ کرتے ہیں سب اپنے اپنے ملک میں ایک دوسرے سے رقابت و ضدیت کی حد تک مختلف ہیں ۔ اس کے مقابلے میں اسلام قبلِ زمانۂ نوح علیہ السلام سے آخری نبوت تک اپنے اٹل اصول کے لحاظ سے ایک ہی چلا آ رہا ہے ۔ آج تک کسی منافقِ رسول نے کسی متقدم نبی کی تنقید و تردید میں ایک لفظ نہیں کہا ۔ سب ہی اپنے سے سابق انبیا کی تائید کرتے چلے آ رہے ہیں ۔ یہ ایک برہانِ قاطع ہے اس حقیقت پر کہ اسلام انسانی دماغوں کی پیداوار نہیں ہے ۔ اس کا ماخذ و منبع ایک ہی واحد مطلق ذات ہے ، جس کی بات زمانہ گزرنے کے ساتھ ناقابلِ عمل نہیں ہو جاتی ۔ قرآن بار بار اس عظمت و ابدیت کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ لاریب فیہ — لا تبدیل لکلمات اللہ — ان تجد اللہ لسنۃ

٦- "اقبالِ کامل"، ص ۵۵ -

تبدیلا ــ علامہ اسی کا ترجمہ کرتے ہیں :

حرف او را ریب نے تبدیل نے آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

جو لوگ علامہ کو اپنے خود ساختہ ٹولے یا جماعت کا موید ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو قرآن اور علامہ دونوں کو نہیں سمجھتے ، یا جان بوجھ کر اپنی کسی ذاتی خواہش کی تکمیل کے لیے وضع و جعل کے مرتکب ہوتے ہیں اور علامہ کو اپنی آڑ بناتے ہیں ۔

علامہ جس پیغمبر ــ فداہ امی و ابی ــ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق سے سرشار تھے وہ خود بھی کسی نئے فرقے کے بانی نہیں تھے ۔ کاش ہم قرآنِ پاک کو اُس وسیع النظری سے دیکھتے جس کا وہ متقاضی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حضورؐ کی سیرت پاک کا مطالعہ کرتے ! ارشاد ہوتا ہے : قل ما کنت بدعاً من الرسل (احقاف : ۹) : اعلان کر دیجیے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں آیا ۔ اس کی تفسیر علامہ عثمانیؒ کی زبان سے سنیے : ''میری باتوں سے اس قدر بدکتے کیوں ہو ؟ میں کوئی انوکھی چیز لے کر تو نہیں آیا ۔ ۔ ۔ ۔''

سورۂ انعام کی آیہ ۸۸ میں اٹھارہ انبیا علیہم السلام کا ایک ہی جگہ ذکر کیا گیا ہے ۔ اجمالاً ان کی صفات ، مراتب اور فضیلت کے بیان کے بعد فرمایا ہے : ھدینا ھم الیٰ صراطٍ مستقیم ــ ہم نے ان کو سیدھی راہ پر چلایا ۔ اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر مخاطب فرمایا ہے : اولائک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ ــ یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی ، سو تو ان کے طریقے پر چل ۔ اس موضوع پر کہ اسلام کوئی نیا فرقہ نہیں اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی نئے مذہب کے بانی و موجد نہیں تھے ، آیات جمع کی جائیں تو ایک الگ مبسوط تصنیف بن جائے ۔ تاہم تھوڑی سی روشنی اور دیکھ لیں : ''ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ ابراھیم حنیفا (نحل ، ۱۲۳) : پھر ہم نے تجھ کو حکم بھیجا کہ ابراہیم کے دین پر چل جو ایک طرف کا ہو رہا تھا ۔

اس کی تفسیر میں لکھا ہے : ''۔ ۔ ۔ ۔ مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام اور دین کی باتوں میں اصل (یعنی بنیاد) ملت ابراہیم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کو خاتم الانبیا بنا کر بھیجا تاکہ اصل ملتِ ابراہیمی کو جو غفلت اور تحریف و تصرف بے جا کی دست برد سے ضائع ہو چکی تھی از سر نو زندہ اور روشن کیا جائے اور شرک کی تمام رگیں کاٹ دی جائیں'' ۔

یہاں یہ حال ہے کہ ہٹلر ازم ختم ، فاشزم ختم ، کمیونزم مسخ ــ کل پیدا

ہوئے ، آج جاں بلب اور اسلام۔بقول شاعر

زاہد زدیں برآمد و صوفی ز اعتقاد ترسا مجدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

وہی ایک بات جو سینکڑوں ہزاروں برس کے 'بعد زمانی اور سینکڑوں ہزاروں کوس کے 'بعد ہائے مکانی کے باوجود کہتے چلے آ رہے ہیں اور کہنے والوں کی بولیاں بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں ، وہ بات آج بھی زندہ و پائندہ ہے اور رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی ۔

اگر علامہ سیاستاً سوشلسٹ اور مذہباً وجودی یا کسی بھی ایسے فرقے سے منسلک تھے جو قرنِ اول کے بعد کی صدیوں میں پیدا ہوا تو کیا وہ تمام انبیا جن کے متفقہ و مسلمہ دین کی طرف علامہ دعوت دے رہے تھے ، سب کے سب سوشلسٹ یا ہمارے کسی نو پیدا فرقے کی جزئیات کے پابند تھے ؟ خدا را انصاف کیجیے ! خزف کو صدف اور صدف کو خزف کہنے والے کدھر جا رہے ہیں ، اور علامہ کو اپنے ساتھ یا اپنے پیچھے چلانے کے لیے کتنا بڑا جھوٹ پھیلا رہے ہیں ؟ اور اسلام و قرآن کی روشنی سے محروم چند لوگ عقیدت مندانِ اقبال کو بھی اپنی تیرہ و تار فضا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے مجبور کر رہے ہیں ۔

اللہ تعالیٰ اپنی ابتدائی وحی سے لے کر آخری وحی تک یہی فرماتا آ رہا ہے کہ "میں ایک ہوں میرا کوئی شریک نہیں ، تمام الہامی کتب اسی پیغام سے بھری پڑی ہیں ، لیکن انہی کتابوں کا دم بھرنے والے کروڑوں انسان کہتے ہیں کہ : ''نہیں جناب ! آپ ایک نہیں ہیں ۔ تین ہیں'' ۔ وہ فرماتا ہے : ''میں بے مثل ہوں'' اور یہ کہتے ہیں کہ "نہیں تیرا ایک بیٹا بھی ہے اور بیٹا باپ کے مثل ہوتا ہے" ۔ اسی طرح اقبال یہ کہتے رہے کہ میں ''مسلم'' اور صرف ''مسلم'' ہوں ، لیکن ان کے بعض شارح فرماتے ہیں کہ ''نہیں جناب ، آپ سوشلسٹ ہیں ، وجودی ہیں'' (وغیرہ وغیرہ) اب اس کا کیا علاج ؟ سونا تو کسوٹی کی گواہی پیش کرتا ہے کہ ''سونا ہوں'' لیکن کچھ لوگ رٹ لگائے جا رہے ہیں کہ ''یہ تو پیتل ہے ۔ کسوٹی اس کی اصلیت نہیں سمجھ سکی'' ۔

تاہم علامہ کی ان آوازوں کو کس طرح دبایا جا سکتا ہے جن میں وہ بار بار دلِ درد مند کے ساتھ قرآن سے لوگوں کی دوری اور بے نیازی کا ذکر کرتے ہیں :

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق
آں یقیں ، آں رنگ و بو ، آں ذوق و شوق

عالمان از علمِ قرآں بے نیاز
صوفیاں درّندہ گرگ و مو دراز

یہ تو مذہبی لوگوں کا حال ہے ۔ اب فرنگی مآبوں کی تعریف بھی سن لیجیے ۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب چشمۂ کوثر بجوئند از سراب

یہ سراب کیا ہے ؟ وہی تو ہے جس کی طرف مختلف ازم دعوت دے رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ فرنگی مآب مسلمان توریت و انجیل کے داعی تو نہیں ہیں ۔ ان کے متعلق آخری فیصلہ یہ ہے کہ

بے خبر از سرِّ دین اند ایں ہمہ اہل کین اند اہل کین اند ایں ہمہ

خدا را سوچیے سرِّ دین بنانے والا شخص سوشلسٹ ہو سکتا ہے ؟

سوشلزم مذہب کو افیون کہتا ہے ، خدا کی نفی کرتا ہے ، یعنی ''لا'' کو اپنی آخری منزل سمجھتا ہے ۔ لیکن علامہ کہتے ہیں :

نہادِ زندگی میں ابتدا ''لا'' انتہا الا''
پیامِ موت ہے جب ''لا'' ہوا ''الا'' سے بے گانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

علامہ جس مسلک کو پیامِ موت کہتے ہیں علامہ کے ''کرم فرما'' ان کو ایسی موت کا پیام بر ثابت کرنے پر تل گئے ہیں ۔ بانیٔ اشتراکیت کارل مارکس پر علامہ کی تلخ تنقید کو ان کے کلام سے کون خارج کر سکتا ہے ؟

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است قلبِ او مومن، دماغش کافر است

اب اس حق کے اوپر چڑھے ہوئے باطل اور دماغی کفر کی شرح بھی علامہ ہی کی زبان سے سنیے :

غریباں گم کردہ اند افلاک را در شکم جوئند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک جز بہ تن کارے نہ دارد اشتراک

یعنی بادام کے چھلکے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا ۔ اس کے اندر جو مغز ہے اس کی کچھ خبر نہیں :

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس بر مساوات شکم دارد اساس

تا آخوت را مقام اندر دل است بیخ او در دل ، نہ در آب گل است

بعض لوگوں نے مادیت سے کلی روگردانی کو اپنا مسلکِ حیات اور ذریعۂ نجات سمجھا ۔ اس کو علامہ اصطلاحاً ذکر کہتے ہیں ، اور بعض نے اپنی تمام استعدادیں مادیت ہی میں کھپا دیں ۔ ان کے خیال میں ورائے مادیت کچھ ہے ہی نہیں ۔ اس کا نام فکر ہے ۔ علامہ اقبال اسلام کی روشنی میں ترکِ دینا اور غرقِ دینا دونوں کے خلاف ہیں ۔ وہ توسط و اعتدال کی راہ کی طرف دعوت دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں :

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر وفکر فکر را کامل ندیدم جز بذکر

ذکر کی تشریح کرتے ہیں :

ذکر ؟ ذوق و شوق را دادن ادب کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب

یعنی صرف اللہ اللہ کہتے رہنے سے ذکر کی تکمیل نہیں ہوتی ۔ ذکر تو روح کی گہرائیوں میں اُتار لینے کی چیز ہے جس کا مظہر انسانی زندگی کے تمام اخلاق و اعمال بن جاتے ہیں ۔

قرآنِ حکیم نے انفاق فی سبیل اللہ کا ایک مکمل نظام قائم کیا ہے جس کی تشریح ہمارے معاشیات کے ماہر علما کئی کتابوں کی شکل میں کر چکے ہیں ۔ علامہ اس کا ذکر جا بجا کرتے ہیں :

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ

جب قرآن کے اندر زر و مال کی افراط و تفریط کا علاج و قانون موجود ہے تو ہم کو قرآن سے باہر دہریت میں اس کی تلاش کی کیا ضرورت ہے ؟

افسوس تو اس بات کا ہے خود مسلمانوں نے بقول علامہ اپنی عملی زندگی سے قرآن کو خارج کر رکھا ہے ۔ اگر وہ اس پر عامل رہتے اور اقوامِ عالم ان کے قابلِ رشک قرآنی معاشرے کو دیکھتیں تو خود بخود اسلام کی طرف منجذب ہو جاتیں ۔ قرنِ اول میں اس کے ثبوت ملتے ہیں جب مسلمان اپنے اعلیٰ کردار سے اغیار کے دل جیت لیتے تھے ۔ علامہ اسی بے عملی اور مقصودِ قرآن کا ذکر فرماتے ہیں :

منزل و مقصود قرآں دیگر است رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست

زبانی عشقِ رسول کے دعوے اور ہماری نعتیہ شاعری عمل کا بدل تو نہیں ہو سکتی ۔

اقبال اور وحدۃ الوجود : علامہ کے ایک شارح فرماتے ہیں : "آخر عمر میں حضرت اقبال بھی وجودی ہو گئے تھے"۷

''علامہ نے ڈاکٹر نکلسن کی خواہش پر ایک مقالہ لکھا تھا ۔ اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیے : ''قرآن مجید میں خدا کے سوا دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے ۔ تبارک اللہ احسن الخالقین ۔ ۔ ۔ ۔ ان سب (وجودی صوفیہ) کا خیال تو یہ ہے کہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جانا ہی انسان کا منتہائے مقصود ہے ۔ اسی میں اس کی نجات ہے" : بقول غالب ، ''عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" ۔

''لیکن اقبال کے نزدیک انسان کا اخلاق اور مذہبی منتہائے مقصود اپنی انفرادی ہستی کو فنا کر دینا نہیں بلکہ اُسے قائم رکھنا ہے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر انفرادیت پیدا کرے اور زیادہ سے زیادہ بے عدیل بنے ۔''۸

مزید لکھتے ہیں :

''قربِ الٰہی کا یہ مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے ۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنے اندر جذب کرے" (صفات الٰہیہ کے جذب کر لینے سے مراد ہے) ۔۹

اسی کو تخلق باخلاق اللہ کہا جاتا ہے اور قران کی زبان سے صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغہ (بقرہ ، ۱۳۸) فرمایا گیا ہے یعنی ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا ، اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے ؟ (شیخ الہند) ۔

مسلمانوں میں وحدۃ الوجود کے اولین مرشد شیخ اکبر کو علامہ نے ہندو فلسفہ ویدانت کا ہم نوا قرار دیا ہے ۔ فرماتے ہیں : ''مسئلہ 'انا' کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی ہے اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مسئلۂ وحدۃ الوجود کے ان تھک مفسر تھے ۔ انھوں نے اس کو اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا ۔''۱۰

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ شیخ سے پہلے اسلامی تخیل میں اس مسئلے کا

۷۔ شاہ محمد عبدالغنی ، ''قرآنی تصوّف اور اقبال'' ، ص ۶۴ ۔
۸۔ پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل ، ''ترجمانِ خودی'' ، ص ۱۸۱ ۔
۹۔ ایضاً ، ص ۱۸۲ ۔ ۱۰۔ ایضاً ، ص ۱۸۶ ۔

وجود نہیں تھا ۔۱۱ اور یہ بھی کہ یہ قرآن سے مستنبط نہیں بلکہ گیتا کی تفسیر کے مماثل ہے ۔ علامہ مزید وضاحت کرتے ہیں : ''تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے 'لمحات' میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے ۔ (جہاں تک مجھے علم ہے) فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں ۔ اس پر میں انشاء اللہ مفصل لکھوں گا ۔''۱۲

مولانا اسلم جیراجپوری کے نام ایک خط میں علامہ لکھتے ہیں :

''تصوف سے مراد اگر اخلاصِ فی العمل مراد لی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے ۔'' ۱۳

کیا ان اقتباسات کے خلاف علامہ نے اپنے کسی مقالہ میں اس خیال سے رجوع کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے وحدۃ الوجود کو اسلامی اور قرآنی چیز قرار دیا ہو ؟ اگر اس کا کوئی ثبوت نہیں تو یہ علامہ پر افترا ہے ۔ اب آئیے ان آیات کی طرف جن سے بعض شارحینِ اقبال نے وحدۃ الوجود کا اثبات کیا ہے :

(۱) ''فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم ، وما رمیت اذا رمیت ولکن اللہ رمی'' (انفال ، ۱۷) : مسلمانو ! تم نے ان کفار کو قتل نہیں کیا ، لیکن اللہ نے قتل کیا ، اور اے رسول ! تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جب پھینکی تھی ، لیکن اللہ نے پھینکی ۔

ہم ان آیات کی تشریح میں شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ، جن کا تفسیری حاشیہ سلف و خلف کا مستند خلاصہ ہے ، سے استفادہ کر رہے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

''تم بے سرو سامان ، قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمھارے زورِ بازو سے کافروں کے ایسے ایسے مُنڈ (بہادر) مارے جاتے ۔ یہ تو خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے ۔ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمھارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں فوق العادۃ قوت پیدا کر دی ، جسے تم اپنے کسب و اختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے ۔''

۱۱۔ شیخ کی وفات ۱۳۸ھ میں ہوئی ۔
۱۲۔ شیخ عطاء اللہ ، مرتب ، کتاب مذکور ، حصۂ اول ، ص ۴۴ ۔
۱۳۔ ایضاً ، ص ۱۴۴ ۔

قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ہے جن میں خالق اسباب ہونے کی حیثیت سے عام انسانی اعمال و افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو بتایا اور انسان کی نفی فرمائی ہے ، مثلاً "افرءیتم ما تحرثون - ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون" (واقعہ ، ۶۳-۶۴) : دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کی زراعت کرتے ہو یا ہم زراعت کرنے والے ہیں ؟ یہاں استفہام انکاری ہے ، یعنی در اصل اللہ حقیقی مزارع ہے -

(۲) ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم "(فتح ، ۱۰) : جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے -

یعنی نبی کے ہاتھ پر بیعت کرنا گویا خدا سے بیعت ہے کیونکہ نبی صلعم خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے ، اسی کے احکام کی تعمیل و تاکید بیعت کے ذریعے کراتا ہے - من یطع الرسول فقد اطاع اللہ : رسول کا مطیع اصل میں اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے -

(۳) "و للہ المشرق و المغرب فاینما تو لوافثم وجہ اللہ" (بقرہ ، ۱۱۵) : اللہ تعالیٰ ہی کا ہے مشرق و مغرب ، سو جس طرف تم منہ کرو ، وہاں ہی اللہ متوجہ ہے (ترجمہ شیخ الہند) -

یعنی یہود و نصاریٰ کا جھگڑا تھا - ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا - اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کسی طرف نہیں بلکہ مکان اور جہت سے منزہ - البتہ اس کے حکم سے جس طرف منہ کرو گے ، وہ متوجہ ہے - تمہاری عبادت قبول کرے گا -

(۴) "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" (ق ، ۱۶) : ہم (یعنی خدا) اس (یعنی انسان) سے نزدیک تر ہیں ، اس کی رگ جان سے -

مطلب یہ کہ ہم (باعتبار علم کے) اس کی روح اور نفس سے بھی نزدیک تر ہیں - یعنی جیسا علم انسان کو اپنے احوال کا ہے ، ہم کو اس کا علم خود اس سے بھی زیادہ ہے - بقول سحابی نجفی

آں کس کہ تو حال خود باو می گوئی
آگاہ نہ کہ او بتو بنمودہ ترا

انسان بطن مادر سے نکلتا ہے تو کچھ نہیں جانتا ، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہوتا ہے - پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے جتلانے اور جنوانے سے اپنے آپ کو اور دوسری مخلوقات کو جاننے لگتا ہے -

(۵) ''ھو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر'' (حدید ، ۴) : تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے - اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو ، اس کو دیکھتا ہے ، یعنی کسی وقت تم سے غائب نہیں ، بلکہ جہاں کہیں ہو اور جس حال میں ہو وہ خوب جانتا ہے اور تمام کھلے چھپے اعمال کو دیکھتا ہے -

(۶) ''ھو الاول و الاخر و الظاہر و الباطن و ھو بکل شی علیم ، (حدید ، ۳) : وہ سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے -

یعنی جب کوئی نہ تھا ، وہ موجود تھا ، اور کوئی نہ رہے گا وہ موجود رہے گا - عرش سے فرش تک اور ذرہ سے آفتاب تک ہر چیز کی ہستی اس کی ہستی کی روشن دلیل ہے - لیکن اسی کے ساتھ اس کی کنہ ذات اور حقائق صفات تک عقل و ادراک کی رسائی نہیں - ظاہر (بمعنی غالب) ایسا کہ اس سے اوپر کوئی قوت نہیں - باطن ایسا کہ اس سے پرے کوئی موقع نہیں ، جہاں اس کی آنکھ سے بوجھل ہو کر بناہ مل سکے - حدیث میں ہے وانت الظاہر فلیس فوقک شئی وانت الباطن فلیس دونک شئی -

(۷) ''و فی الارض آیات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون (ذاریات ، ۲۰-۲۱) : اہل یقین کے لیے زمین میں اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں - کیا تم کو سوجھتا نہیں ؟ (شیخ الہند) -

یعنی انسان اگر خود اپنے اندر یا روئے زمین کے حالات میں غور و فکر کرے تو بہت جلد اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ ہر نیک وبد کی جزا و سزا ضرور مل کر رہے گی ، جلد بدیر -

یہ ہیں ان آیات کے سیدھے سادے معنی جو صحابہ سے لے کر آج تک مفسر و مترجم سمجھتے چلے آ رہے ہیں اور سیاق آیات بھی انہی کی تائید کرتا ہے - پھر کیا تمام صحابہ نے یا کسی ایک ہی صحابی نے ان آیات میں سے کسی ایک آیت سے وحدۃ الوجود کا مسلک سمجھا تھا ؟

قرآن حکیم اپنے آغاز سے اخیر تک خالق و مخلوق کو الگ الگ بتاتا ہے - سورۂ فاتحہ سے اعوذ برب الناس تک دیکھتے جائیے - ایاک نعبد و ایاک نستعین — ایک عابد ہے ، دوسرا معبود - ایک منگتا ہے ، دوسرا داتا - ایک پناہ مانگ رہا ہے ، دوسرا پناہ دینے والا - ایک جنا ہوا اور جننے والا ، دوسرا لم یلد و لم یولد - ایک بیمار ، دوسرا شافی ، بقول حضرت ابراہیم : اذا مرضت فھو یشفین (شعرا ، ۸۰) - ایک مرتا ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر دوزخ یا بہشت میں جاتا ہے ،

دوسرا وہ ہے جو سزا و جزا دیتا ہے ۔ خدا را بتائیے کہ مرنے کے بعد تک تو یہ فرق اور دوئی موجود رہتی ہے ۔ پھر وحدۃ الوجود کا قطرہ دریا میں کب فنا ہوگا ؟ علامہ کے سامنے یہ سب آیات تھیں ۔ وہ روزِ حشر کی پرسش کے تصور سے لرزتے تھے ۔ اس عاجز نے ان کو ذکرِ آخرت پر روتے اور سسکیاں بھرتے دیکھا ہے ۔ ان کا مشہور رباعی نما قطعہ ہے :

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
ور حسابم را تو بینی ناگزیر از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اور یہ بھی فرمایا :

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

ہاں اگر وحدۃ الوجود کے کوئی اور فلسفیانہ معنی ہیں تو اسلام جو ایک عملی دین ہے ایسی پیچیدگیوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا ۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

خود قرآن نے بےکار بحثوں سے روک دیا ہے : لیس کمثلہ شیٔ (شوریٰ ، ۱۱) : اس کی مثل کوئی شے نہیں ، یعنی ذات ، صفات اور احکام میں کوئی اس کا مماثل نہیں ۔ نہ اس کے دین کی طرح کوئی دین ہے ، نہ اس کا کوئی جوڑ ہے ، نہ ہمسر اور ہم جنس (عثمانیؒ) ۔ فلا تضربو للہ الامثال (نحل ، ۷۴) : مت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں ۔ تفکروا فی خلق اللہ و لا تفکروا فی اللہ : اللہ کی مخلوقات میں غور فکر کرو ، لیکن اس کی کنہِ ذات میں مغزپچی نہ کرو ۔ بقول مولوی غلام رسولؒ:

حادث کیا قدیموں جانے ؟ جے لکھ اُڈے ہوائیں
ڈب مریندیاں عقلاں حیرت دے دریائیں

اور بقول سعدی

چہ شب ہا نشستم درین دہر گم کہ حیرت گرفت آستینم کہ قم
درین ورطہ وچ کشتی فروشد ہزار کہ پیدا نشد تختۂ بر کنار

یہ ہیں ان تمام آیات کے سیدھے سادے معانی و مفاہیم جو تمام قدیم و جدید لقہ مفسرین کے نزدیک بلا اختلاف چلے آ رہے ہیں ، سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق علامہ نے کہا ہے :

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

زیادہ اشعار کی بھرتی اور مثالیں دینے کی ضرورت نہیں - ہر شخص جس نے علامہ کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا جانتا ہے کہ ان کی شاعری حضرت کا آغاز عشق حجاز سے ہوا :

نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے میری

اور پھر زندگی بھر وہ اسی عشق کے زیر اثر اسلام و مسلمین کی خدمت کرتے رہے ، یہاں تک کہ ان کا انجام بھی اسی آرزو پر ہوا :

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

سرود رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اب ان کی وفات کے سالہا سال بعد کچھ لوگ ان کی تمام فکر و کاوش کا قبلہ ماسکو کو بنانا چاہتے ہیں - اگر وہ ہم میں موجود ہوتے تو یہ لوگ ایسی جسارت کر ہی نہیں سکتے تھے ، اور اگر کوئی سر پھرا ایسی حرکت کرتا تو وہ اس سے پوچھتے کہ ''تم مجھ کو مجھ سے زیادہ جاننے والے ، بلکہ مجھ کو میرا نقیض ثابت کرنے والے کہاں سے پیدا ہو گئے ؟''

وہ تو اپنی آخری کتاب ''ارمغان حجاز'' میں ، عمر کی آخری منزل میں حرم ، حجاز اور یثرب ہی کا ورد کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے - چنانچہ ملاؔ سے گریزاں ہونے کا سبب ہی یہ بتاتے ہیں :

ازاں بگریختم از مکتب او کہ در ریگ حجازش زمزمے نیست

حرم کعبہ سے اپنے روحانی رشتے کا ذکر کرتے ہیں :

حرم تا در ضمیر من فرو رفت سرودم آنچہ بود اندر ضمیرش

بستر مرض پر لیٹے ہوئے بھی دنیائے خیال میں سفر یثرب کی تیاری ہو رہی ہے :

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ

طویل بیماری اور عالم پیری — بیک وقت دونوں کا حملہ ہو رہا ہے - اس پر بھی عزم و ہمت کی بلندی دیکھیے :

بایں پیری رہ یثرب گرفتم نوا خواں از سرود عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام کشاید پر بہ فکر آشیانہ

یعنی ان کے طائر روح کا اصلی نشیمن یثرب ہے - اس کے سوا دنیائے آباد

کا کوئی شہر انھیں اپنی گلیوں کی طرف نہیں کھینچ سکتا ۔

محترم سامعین ! ایسے شخص کو کوئی شخص سوشلسٹ ثابت کرنا چاہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بصارت سے محروم ہے اور دوسروں کی آنکھوں میں بھی مٹی جھونکنا چاہتا ہے ، یا پھر جان بوجھ کر :

بدو زد طمع دیدۂ ہوش مند

کا مصداق بن رہا ہے ۔ قرآن حکیم نے ایسے ہی لوگوں کی شان میں فرمایا ہے : ''لھم قلوب لایفقھون بہا و لھم اعین لا یبصرون بہا ولھم آذان لایسمعون بہا'' (اعراف : ۱۷۹) : ان کے دل تو ہیں ، ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے اور آنکھیں بھی ہیں ، اس کے باوجود دیکھتے نہیں ۔ کان بھی رکھتے ہیں ، ان سے صحیح بات نہیں سنتے ۔

قومِ اقبال کا فرض ہے کہ ایسے ہاتھوں سے قلم چھین لے جو اقبال کو مسخ کر رہے ہیں ۔ یہ بات حکومتِ پاکستان کے منشا کے عین مطابق ہوگی جس کے آئین میں اسلام کی اہمیت کا اعتراف موجود ہے کہ اس ملک میں کوئی خلافِ اسلام بات برداشت نہیں کی جائے گی :

یا رب زسیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بت خانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

مقالہ ختم ہوا ، اس کی تکمیل کے بعد علامہ کے وحدۃ الوجودی ہونے کے خلاف مجھے چند سطور اور مل گئیں ۔ وہ بھی مناسب حال ہونے کی وجہ سے پیش کرتا ہوں ۔ ان کے صاحب زادہ جسٹس جاوید اقبال نے پچھلے دنوں ایک طویل تقریر کی ۔ اس میں انھوں نے کہا :

''اقبال نے اپنی زندگی کا آغاز ایک وحدۃ الوجودی ، ہندوستانی قوم پرست اور مطلق پرست کی حیثیت سے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قیامِ یورپ کے دوران ہی وحدۃ الوجود ، لادین نیشنلزم اور وطن پرستی کے نظریات کو ترک کر دیا ۔ اقبال نے محسوس کیا ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ اسلام اپنی ذات میں اکمل ہے ، یہ اپنے سے جدا کسی ازم یا نیشنلزم اور دوسرے ازم کو برداشت نہیں کرتا ۔''[۱۴]

اس اقتباس سے ان کے غیر وحدۃ الوجودی ہونے کے ساتھ ہی غیر سوشلسٹ ہونے کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے — اور آگے بڑھیں تو یہ سطور ملتی ہیں :

۱۴ ۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' ، لاہور ، مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۷۵ ۔

''انسان ایک معین خودی اور ایک شخصیت کا حامل ہونے کے باعث خدا سے علیحدہ و منفرد ہے ۔ انسان آزاد ہے ۔ ۔ ۔ ۔ انسان اور خدا انتہائی متحرک و فعال شخصیات کے حامل ہیں ۔ وہ ایک دوسرے سے ممتاز و منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق و دمساز بھی ہیں ۔ پانی کے قطروں کے بحر میں ضم ہو جانے کی مثال کا اطلاق صرف انہی خودیوں پر ہوتا ہے جو اپنے استحکام و فروغ میں ناکام رہتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کا مقدر انفرادیت کی حدود سے نجات پانا نہیں ، بلکہ اس کا مزید اور واضح تعین ہے''۔

اس اقتباس میں مروجہ تصوف کے اس عقیدے کی واضع تردید ملتی ہے کہ

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اپنے ابدی اصول و اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے اغیار کے ہنگامی افکار کی پیروی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''دستِ سوال دراز کرنا دوسرں سے بسر اوقات کے ذرائع مانگنے تک محدود نہیں ، بلکہ اس میں دوسروں کی فکری دریوزہ گری بھی شامل ہے ، جو انجامِ کار نقل اور تقلید کرنے اور بالاخر غلامی و محکومی تک نوبت پہنچا دیتی ہے ۔ غلامی سے افراد اور معاشرے فنا ہو جاتے ہیں ۔''۱۵

علامہ کی یہ ثابت شدہ صراحتیں اور وضاحتیں ہیں جن کی علامہ ہی کے ہم وطن و ہم عصر بلند ترین آواز سے تکذیب و تردید فرما رہے ہیں :

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

۱۵- ایضاً ، مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۷۵ -